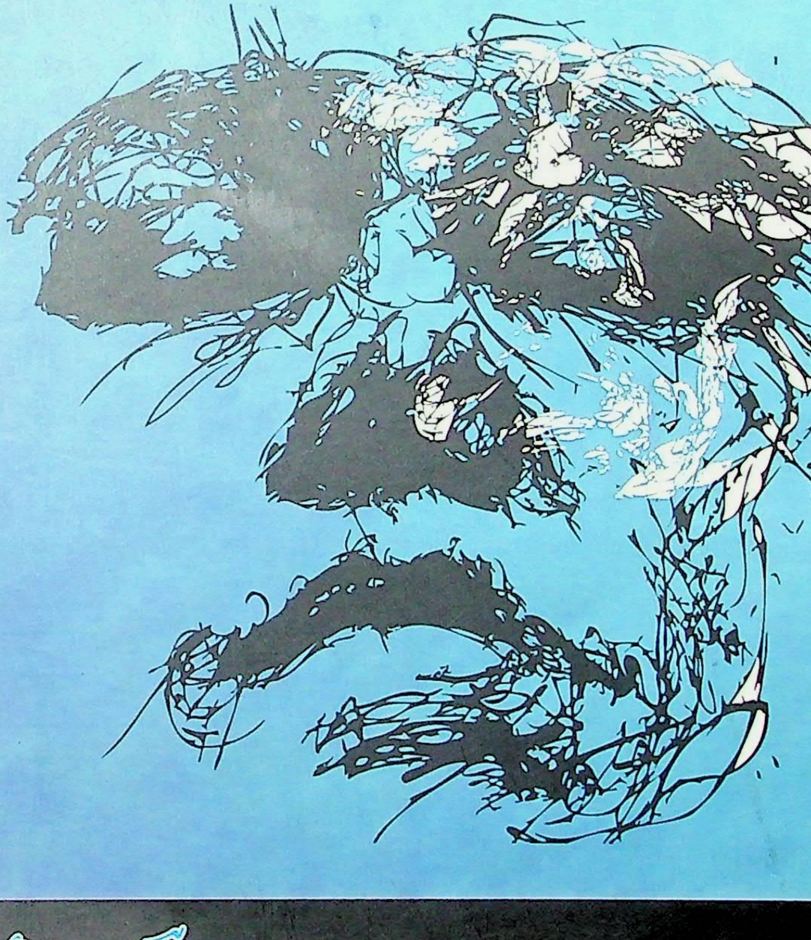
لب تشنہ
آنکھ سمندر



ساغر صحرائی

16

لب تشنہ آنکھ سمندر

ساغرؔ صحرائی



'Lab Tashna Aankh Samandar'

SAGHAR SEHRAI

Year of Publication-2018
ISBN:978-81-931169-4-4
Price Rs.350.00

کتاب کا نام : لب تشنہ آنکھ سمندر

شاعر : ساغرؔ صحرائی

کمپوزنگ : آئی آئی ایل ایس، 471-A، مُٹھی جموّں

سنہ اشاعت : ۲۰۱۸ سنہ

تعداد : ۵۰۰

قیمت : تین سو پچاس

سرورق : شیخ خالد کرارؔ

مطبع : سیاق پرنٹرز

ناشر : سیاق

کتاب ملنے کا پتہ:

■ ساغرؔ صحرائی

محلہ اُلفت نگر، مکان نمبر 123، دریچہ لنک روڈ، متصل یونیوسٹی روڈ، بھدرواہ -182222۔ موبائیل نمبر: 9858235234

■ کتاب گھر لال چوک سرینگر / کنال روڈ جموں۔

■ ہمالیہ بک ڈپو، شہیدی چوک جموّں۔

BOOKS

سیاق

THE CONTEXT

SIYAQ PUBLICATIONS

59/A, Tawi Vihar, Sidhra, Jammu-180019 (J&K)

www.urdualive.com, siiaqpublications@gmail.com, 09086261113

e-book available

اِنتساب

عطا کیا ہے جنہوں نے مجھے شعورِ دوام
خُدا کے بعد معالمین و والدین کے نام

(ساغرؔ صحرائی)

فہرست

ساغرؔ صحرائی: گنجینۂ جذبات و حقائق

زیرِ عنواں مسودہ پر اگر چہ کسی طویل و بسیط تقریض یا مقدمے کی گنجائش نہیں تاہم راقم یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ چند گذارشات قارئین اکرام کی نذر کروں۔ جن سے اِس شعری مجموعے کو منظرِ عام پر لانے کے اسباب و محرکات سے آگاہی یقینی ہو سکے۔

ادب و ثقافت سے وابستہ حضرات کے لئے دورِ حاضر کا ذہنی و فکری میلان ایک لمحہ فکریہ سے کم نہیں۔ مادیت کے اِس دورِ پُر فریب اور زندگی کی کشمکش نے ہمارے لطیف جذبات کو افسردہ کر دیا ہے۔ جذبات کی افسردگی، طبیعت کی دورنگی اور مذاقِ سخن کی نادُرستی اِن سب کے مجموعی اثرات نے شعر کے حُسن پر غلط فہمیوں کا پردہ ڈال دیا اور اُردو شاعری کو بالخصوص ہماری نِگاہوں میں سُبک کر دیا۔ ہمارا تعلیمی نظام ایک مُدت تک ایسا رہا کہ جن لوگوں نے عمریں تحصیلِ علم کی نذر کر دیں اور یونیورسٹیوں کی سندیں جان کے مول خریدیں، وہ اپنی زبان سے ناواقف اور اپنے ادب سے نا آشنا رہے۔ ساغرؔ صحرائی نے شاید ایسے ہی اشخاص کے بارے میں کہا ہے کہ

کر دیا جن کو گُھٹن سے عہدِ نو نے ہمکنار
اُن حسیں معصوم بچوں کل کے اِنسانوں کے نام

گر چہ اب انگریزی تعلیم یافتہ طبقے میں اُردو ادب سے وہ ناواقفیت تو نہ رہی جو پہلے تھی، لیکن ادب کے ہر شعبے کو مغربی تنقید کی عینک سے دیکھنے کی عادت ہوگئی۔ مغرب سے آئی جدید تنقید میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن وہ اپنے مقصد کے لئے جذبات سے زیادہ خیالات کو، تاثرات

سے زیادہ افکار کو، ہیئت سے زیادہ مواد کو پیش نظر رکھتی ہے۔ یہ طریقہ کار ادب کی دیگر اصناف کے لئے اگر مناسب ہے بھی تو شاعری کے لئے نہیں ہے۔ شاعری کی بعض صِنفوں کے لئے اگر مناسب ہے بھی تو قدیم غزل کے لئے نہیں ہے۔ ہماری قدیم شاعری دِل کی آواز اور جذبات کی زباں ہے۔ یوں بھی بقول ڈاکٹر سعادت بریلوی:

''شاعری جذبات کی دِل آویز موسیقی ہے۔ احساسات کی حسین مصوری ہے۔ تخیل کا ایک رقصِ دِلفریب ہے وہ جنت نگاہ بھی ہے اور فردوسِ گوش بھی۔ اِس کا اثر دِل و دماغ دونوں پر ہوتا ہے۔ وہ حواس کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ وہ جذب وشوق کی ایک لغزشیں مستانہ ہے عقل وشعور کا ایک حسین ارتعاش ہے۔ حسن و جمال کی ایک دِل موہ لینے والی لطیف تھرتھراہٹ ہے۔ ہمارے ایک شاعر نے اس کو عقل وجنوں کی مشترک بزم جمال اور عشق و حکمت کا مقامِ اتصال کہا ہے۔ یہ محض شاعرانہ خیال نہیں ہے، ایک حقیقت ہے۔ شاعری جذبات کے ساتھ ساتھ شعور وادراک سے بھی گہرا ربط رکھتی ہے۔ زندگی میں اس سے اُجالا ہوتا ہے۔ افراد اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں وہ جینا سیکھاتی ہے۔ زندگی کا احساس بڑھاتی ہے۔ اس کو برتنے اور بسر کرنے کا شعور پیدا کرتی ہے۔ اس کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی بدولت تھوڑی دیر کے لئے انسان اپنی سطح سے بُلند ہو جاتا ہے۔ اس کی روح میں کوکچھ اِس طرح نغمے گونجنے لگتے ہیں کہ خود اس کی ہستی ایک نغمہ سا بن جاتی ہے۔''

شاعری کے اِن دوررس اثرات کے پیچھے جو شے خاص طور سے اہمیت کی حامل ہے وہ ہے جذبہ۔ سید مسعود حُسن رضوی ادیبؔ نے اپنی کتاب ''ہماری شاعری'' میں ایک جگہ بجا طور لکھا ہے کہ ''دُنیا میں جو کچھ رونق اور چہل پہل ہے وہ جذبات کی بدولت ہے۔ اگر جذبات فنا ہو جائیں تو رشتے ٹوٹ جائیں، تعلُق چھوٹ جائیں۔ انسانیت اور حیوانیت کے بیچ میں ایک دُھندلا سا خطہ فاصل رہ جائے۔ انسان کو حیوان پر جو فضیلت ہے وہ صرف عقل ہی کی بنا پر نہیں ہے۔ جذبات بھی انسانیت کا طُرہِ امتیاز ہیں۔ یہی جذبات جب لفظوں کا لباس پہن لیتے ہیں تو شعر کہلاتے ہیں۔ حالانکہ اس کے باوجود بعض لوگ شعر کو بے کار اور شاعری کو بے کاری کا مشغلہ

کہتے ہیں۔ مولانا صفی لکھنوی نے اِن نافہموں کو ایک نہایت مختصر اور جامع جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

شاعری کیا ہے؟ دِلی جذبات کا اِظہار ہے
دِل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار ہے

علمی دُنیا میں ڈارون کا نام کون نہیں جانتا اِبتداء عمر میں اُسے شعر وسُخن سے بہت دلچسپی تھی۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

''تیس برس کی عمر تک شاعری کی اکثر اصناف میں مجھے بہت لذت مِلتی تھی، لیکن اب کئی سال سے ایک مصرع پڑھنا بھی میری قوتِ برداشت سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دماغ ایک مشین ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ حادثات اور واقعات کو جمع کر کے ان سے عام اصول اخذ کیا کرے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے دماغ کا صرف وہی حصہ کیوں بے کار ہو گیا ہے جس پر لطیف احساسات کا دارومدار ہوتا ہے...... اگر مجھے اپنی زندگی پھر سے مِل جاتی تو کم سے کم ہفتے میں ایک دفعہ کُچھ اشعار پڑھ لینا اپنا معمول کر لیتا۔ اس تدبیر سے شاید میرے دماغ کے وہ حصے جواب بے کار ہو گئے ہیں استعمال میں رہنے کی وجہ سے مردہ نہ ہونے پاتے۔ اِن دلچسپیوں کا مِٹ جانا مسرت کا معدوم ہو جانا ہے۔ اور چونکہ اس سے ہمارے نفس کا وہ حصہ کمزور ہو جاتا ہے جس کا تعلق جذبات سے ہے۔ لہذا یہ شاید ہمارے ذہن کے لئے اور غالباً ہمارے اخلاقیات کے لئے مضر ہے۔''

امریکہ کے مشہور ماہرِ نفسیات پروفیسر جیمس لکھتا ہے ''ڈارِون کے اِس بیان سے لوگوں کو سبق لینا چاہئے اور ہر شخص کو کم سے کم دس منٹ روز شعر وشاعری کے لئے وقف کر دینا چاہئے تا کہ جذبات مردہ نہ ہونے پائیں۔''

نوشتہ بالہ اقوال کسی شاعر کی زبان سے نہیں نکلے ہیں بلکہ ایک مشہور فلسفی اور سائنس داں کے غور وفکر کا نتیجہ ہے جو اُس نے ذاتی تجربوں سے حاصل کئے ہیں۔ حالانکہ فلسفہ وسائنس شعر وشاعری کے دو بڑے دُشمن سمجھے جاتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اِن اقوال سے شعر کو بے کار سمجھنے والے دماغوں کی اصلاح ہو جائے۔ چونکہ بقولِ فارسی شاعر

خوشتراں باشد کہ سیر دلبراں

گفتہ آمید بہ حدیثِ دیگراں

یہ سچ ہے کہ شعر سے لازمی طور پر کوئی مالی فایدہ حاصل نہیں ہوتا ہے لیکن اگر ذہن کی تیزی، دِل کی شگفتگی، روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری کا شمار بھ ※ فایدوں میں ہے تو شعر و شاعری کے مفید ہونے کا کون اِنکار کرسکتا ہے؟

شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے۔ سوتے احساس کو جگاتی ہے۔ مردہ جذبات کو جِلاتی ہے، دِلوں کو گرماتی ہے حوصلہ کو بڑھاتی ہے، مصیبت میں تسکین دیتی ہے۔ مشکل میں استقلال سِکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گری ہوئی قوموں کو اُبھارتی ہے۔

شاعری کا ایک کُھلا ہُوا فایدہ اور بھی ہے کہ کوئی نظامِ تعلیم جو شعر سے مدد نہ لے کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ شاعری مُشکل ترین علوم کو ہضم کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ مغرب کا دور تاریک دورِ تاریک ہی رہتا اگر شاعری نے آگے بڑھ کر مُشکل علوم وفنوں کو ہضم کرنے کا حوصلہ نہ بخشا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا مقصد اب تک یہی متعین ہوتا چلا آ رہا ہے کہ قدرت نے جو قوتیں انسانیت میں چھُپا رکھی ہیں وہ ظاہر کردی جائیں۔ فنِ تعلیم کے ماہرین کا یہ ماننا ہے کہ جو تعلیم اِنسان کی بعضِ قوتوں کو اُبھارے اور بعض کو دبائیے یا دبا رہنے دے اِس سے نفع کیا نقصان کا خوف ہے۔ یہ مُسلم ہے کہ قوتِ متخیلہ کی ترقی اور جذبات کی تربیت کا شعر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ جو تعلیم جذبات کی نشوونما اور اُن کی تربیت وتہذیب سے چشم پوشی کرے گی اس سے تکمیل اِنسانیت کا فایدہ حاصل نہ ہوگا اور یہ ہوا تو تعلیم کا اصل مقصد ہی فوت ہوگیا۔

معزیز قارئین زیرِ عنواں نوشتہ بالا چند گذارشات کے بعد شاید یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کے دیدہِ زیب شعری مجموعہ کے پیچھے کون سے عوامل ومحرکات کارفرماں ہیں۔ جن کے پیشِ نظر راقم نے ساغرؔ صحرائی کے بیاضِ کبیر کے اِبتدائی حصے کو منظرِ عام پر لانے کیلیئے ساغرؔ صحرائی کو مجبور کیا اور ساغرؔ صحرائی نے میری اِس تحریک پر حامی بھر کے مجھے عزّت بخشی جس کیلیئے میں اُن کا شُکر گُذار ہو۔ کیا بعید ہے کہ اخلاقی کساد بازی کے اِس دور میں اس اثاثے سے کوئی ایسی چنگاری پھوٹ پڑے جو اِس مکر وفریب کے حالے کو جلا کر عالمِ تب وتاب کا سُراغ فراہم کرے۔

مزید برآں یہ کہ ہماری شاعری گذشتہ پانچ چھ دہائیوں میں پیدا ہونے والے مختلف رُجحانات اور رنگا رنگ تجربات کا ایک حسین مُرقع ہے۔ اور خود اس کا مطالعہ بھی ایک دلچسپ تجربہ

ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ذہنی اور فکری پہلوؤں کو سلیقے سے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اور ساتھ ہی جمالیاتی اِظہار میں ایسے ایسے گُل بوٹے کھِلائے ہیں جس نے اُس کو دامانِ باغباں اور کفِ گل فروش بنا دیا ہے۔ لیکن یہ مطالعہ تب تک ـــــ اُدھورا ہی رہے گا جب تک نہ یہ تمام شعری اثاثہ چھپ کر منظرِ عام پہ آئے۔

گو کہ کسی ایک شعری مجموعے کے پیشِ نظر کسی شاعر کا تعین قدر کرنا امرِ محال اور قبل از وقت ہوگا، وہ بھی ساغر صحرائی جیسے شاعر کا جس کا بہت سارا شعری اثاثہ ابھی منظر عام پر آیا چاہتا ہے لیکن پھر بھی ذوقِ سلیم رکھنے والے حضرات کی آراہ کا منتظر رہوں گا۔

ڈاکٹر امتیاز احمد بھلیسی

□□□

اپنی بات

بُنیادی طور پر اِنسان اپنے خالق، خالقِ کائنات کا شُکر گزار ہے جِس نے اپنے بندوں کو اِس قدر نعمتوں سے نوازا ہے جِن کا احاطہ کرنا اِنسان کے بس میں نہیں۔ شاید اِسی لئے مرزا غالبؔ نے فرمایا:

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تُو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

بہرکیف اِنسان کو جس قدر اختیار دِیا گیا ہے اُسے حسبِ مقدور اپنی طرف سے اُن تمام محبان کا دِل کی عمیق ترین گہرائیوں سے شُکریہ ادا کرنا چاہیے جو زندگی کے سفر میں اُس کی رہنمائی ورہبری کرتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انسان تو کیا ہوا، پانی فضا، حالات واقعات، مصائب و مشکلات جو انسان کو نئی منازل اور دشاؤں سے روشناس کرتے ہیں اور انسان ان حالات، واقعات سے جو مشاہدات کرتا ہے اِنسان کو اُن سب کا بھی شُکر گزار ہونا چاہیے۔ چہ جائے کہ اُن لوگوں کا جو ہر وقت کسی انسان کی ہر قسم کی مدد اور رفاقت کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

میرے ادبی وشعری سفر میں کتنے ہی ادب نواز، ادب پرور اور ادب

دوست لوگوں نے مجھے اپنی تخلیقات چھپوانے کی صلاح دی اگر اُن دوستوں اور محبان کے نام گنواتا پھروں تو ایک طویل فہرست مرتب ہوگی۔

دراصل میں اپنی تخلیقات کو چھپوانی کی جسارت نہیں کرتا اگر میرے دِل میں یہ خیال نہیں اُبھرتا کہ اِنسان جو کُچھ بھی تخلیق کرتا ہے وُہ دراصل اُس پر ذات الٰہی کی طرف سے ودیئت ہُوا کرتی ہیں۔ اور اگر کوئی ادیب، شاعر یا مُصنف اپنے اِن خیالات کو اپنے تک ہی محدود رکھے تو وُہ میرے یقین کے مطابق کُفرانِ نعمت کا شکار ہو کر خیانت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ ایسا ہونے کے باوجود بھی شاید میں ایسا نہیں کرتا اگر میری تخلقات کو اشاعت کے مراحل سے گُذارنے کیلیئے ڈاکٹر امتیاز بھلیسوی (اسسٹنٹ پروفیسر) جو میری دانست میں اُردو زبان و ادب کا دیوانہ ہے اور مجھے اِس نوجوان میں اُردو زبان و ادب کی خدمت کا ایک آتش فشاں دِکھائی پڑتا ہے۔ اِس نوجوان نے ہی مجھے مجبور کیا تو آج یہ کتاب قارئین کے ہاتھ میں ہے۔ میں اِس نوجوان کا لفظہ شُکریہ سے شُکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ علاوہ ازیں میں عزیزم رنکو کول جنہوں نے اِس کتاب کو سنوارنے اور سجھانے میں میری ماؤنت کی کا بھی دِل کی عمیق ترین گہرائی سے شُکریہ ادا کرتا ہوں۔

ایک اور بات، اکثر کتابوں میں مصنف اپنی بات رکھتے ہیں لیکن میں اِس سلسلہ میں بظاہر کوئی بات نہیں رکھ رہا ہوں کیونکہ میری تخلیق ہی میری بات ہے جو دراصل شروع سے لے کر آخر تک میری ہی بات ہے۔

□ ساغرؔ صحرائی

غزل

لب تشنہ اور آنکھ سمندر صحرائی
باہر ساغر اندر ساغرؔ صحرائی
گھر سے باہر نکلا تو اک محشر تھا
مار رہا تھا سب کو پتھر صحرائی
میرے بدلے محفل میں بیٹھا تھا کون
اوڑھ کے اپنے سر پر چادر صحرائی
غور کرو تو قطرے قطرے کا محتاج
یوں تو ہر اِک گام سمندر صحرائی
جانے کب تو اُس کے دل میں آٹھہرا
مار چُکا تھا سب کو ٹھوکر صحرائی
باہر سے کچھ اور ہے تو اندر سے اور
لیکن میرا باہر اندر صحرائی
اوروں کی قسمت میں پل پل موت کا خوف
صحرائی ہر سانس قلندر صحرائی
گلیوں، کوچوں، اپنوں غیروں میں بدنام
پاگل، مجنوں، وحشی ساغرؔ صحرائی

غزل

میرا کِسی نے نام لِیا تیرے نام سے
صدیوں کی پیاس بُجھ گئی اِس ایک جام سے

گُم گشتہ ایک مکیدے کی آرزو لئے
آوارگی کا جام لئے ہوں میں شام سے

یا ربّ زباں ہو ایسی عطا میرے قلم کو
بجھتے چراغ جل اُٹھیں میرے کلام سے

یہ ساری کائنات ہو زیرِ نگیں ترے
نسبت اگر نصیب ہو خیرالانعام سے

اِنسان کی تلاش اب بے سود ہے ساغرؔ
کب کا اُتر چُکا ہے یہ اپنے مقام سے

عشق تجارت ہے میری
دل کا سودا کرتا ہوں

غزل

کیجئے اِک نظر اِک نظر کیجئے
میری آوارگی مختصر کیجئے

شوقِ فرہاد کو رہگذر کیجئے
پتھروں سے محبت اگر کیجئے

کر سکو جو دِلوں میں تو گھر کیجئے
ورنہ ذکرِ وفا مختصر کیجئے

پیکرِ عشق کوئی ملے گر کہیں
جُستجو کیجئے راہ بر کیجئے

راس آتی نہیں مجھ کو ٹھنڈی ہوا
راستوں کو مرے بے شجر کیجئے

اس کو رہنے نہ دیں ایک دیلز پر
اپنے احساس کو دربدر کیجئے

اس کی معصومیت تم کو کھا جائے گی
اتنی یلغار مت شاخ پر کیجئے

اِک زمیں کے لئے اتنی خوں ریزیاں
کچھ اِدھر کیجئے کچھ اُدھر کیجئے

وسعتِ قلبِ آدم ہے ساغرؔ بہت
دفن سینے میں یہ بحر و بر کیجئے

☆

قطعہ

اُس نے کہا ایسے چلوں
کہتا ہے یہ ویسے چلوں
اُلجھا گئے دونوں مجھے
میں کیا کروں کیسے چلو
بہتر ہے آنکھیں موند کر
چلتا چلوں جیسے چلوں

☆

زخم خوردہ ہے داستاں میری
کون سمجھے یہاں زُباں میری
میں پریشاں ہُوں اب میں کیا بیچوں
بیٹیاں ہو گئیں جواں میری

☆

غزل

کاغذی کشتیاں بہائے گا
جب بھی بچپن مجھے ستائے گا

ایک دِن، وہ ضرور آئے گا
ہنسنے والوں کو جو رولائے گا

ختم ہو جائے گی سفر کی تھکان
جب مرا ساتھ تو نبھائے گا

اپنی تنہائیوں کی محفل میں
تو مجھے ساتھ ساتھ پائے گا

تُجھ کو دُنیا معاف کر دے گی
مجھ کو ہر شخص آزمائے گا

لوگ مجھ کو کہیں گے سودائی
اور تُو مجھ کو چھوڑ جائے گا

مے کشی آسمان چھو لے گی
اور ساغرؔ فریب کھائے گا

غزل

ہم تو نالاں تھے شہر پر اپنے
غیر تو غیر تھے مگر اپنے!

کیا کہیں کس قدر ہیں ہم آزاد
جیسے زنداں ہیں اب یہ گھر اپنے

ہم ہیں صحرا نوردیوں کے اسیر
تم سنبھالے پھیرو شجر اپنے

اپنی پرواز پا گئی معراج
جب سے ٹوٹے ہیں بال و پر اپنے

عمر بھر گھر سے اختلاف رہے
تم سے نالاں رہیں اگر اپنے

کتنے بے حس ہیں لوگ صحرائیؔ
سوچ اوروں کی اور سر اپنے

غزل

کہہ گئے لوگ بے ثمر مجھ کو
ناز کتنا تھا شاخ پر مجھ کو

مُشکلوں سے ملا تھا گھر مجھ کو
لے اُڑا پھر کوئی سفر مجھ کو

مجھ کو آوارگی نے لوٹ لیا
ڈھونڈتی ہے مری نظر مجھ کو

ایک روٹی ہوں نفس کی دُنیا
کھینچتی ہے اِدھر اُدھر مجھ کو

کہہ رہا تھا یہ تیشہ ٔ فرہاد
کیوں میسّر نہیں وہ سر مجھ کو

یاد کرتی ہے اب بھی شام وسحر
میرے بچپن کی رہگذر مجھ کو

پھر سے صحرائی ہو گیا ساغر
دے گیا کون یہ خبر مجھ کو

غزل

میں اگر تجھ کو سوچتا رہتا
کس لئے بُت تراشتا رہتا

کہہ رہا تھا یہ میرا آئینہ
کاش میں تُجھ کو دیکھتا رہتا

لوگ مجھ کو تلاشتے رہتے
اور میں خود کو سوچتا رہتا

یاد تیری اگر چلی جاتی
پھر مرے پاس اور کیا رہتا

جن سے وابستہ ہیں تری یادیں
ایسے رستوں کو چومتا رہتا

وہ کہ اِک بار ٹوٹ کر برسے
میں کہ تا عمر بھیگتا رہتا

اِک جگہ ٹھہرتا اگر ساغرؔ
دربدر یوں نہ گھومتا رہتا

غزل

مرا دِل مرا ہم زباں ہو رہا ہے
قلم کی زباں سے بیاں ہو رہا ہے

تخیّل مرا آسماں ہو رہا ہے
مرے دِل کا پنچھی جواں ہو رہا ہے

میں اِک اجنبی سا ہوں اپنے ہی گھر میں
جو گھر تھا مرا اب مکاں ہو رہا ہے

یہ آنسو، یہ آہیں، یہ مُہرِ خموشی
نہاں تھا جو دِل میں عیاں ہو رہا ہے

کوئی بات تو ہے ستمگر وگرنہ
خُدا جانے کیوں مہرباں ہو رہا ہے

چلا آ رہا ہے مرے دل میں کوئی
مرا دل کسی کا مکاں ہو رہا ہے

تُو ہی تُو ہے ساغرؔ کے قلب وجگر میں
ترا نام وردِ زباں ہو رہا ہے

غزل

کچھ اِس میں کوئی بُوتا بھی نہیں
جنگل ویراں ہوتا بھی نہیں

بچے کی کونسی منزل ہے
ہنستا بھی نہیں روتا بھی نہیں

یہ میرا سفر ہے میں جانوں
طے ہوتا ہے ہوتا بھی نہیں

یہ درد بلا کا درد صنم
ہوتا ہے مگر ہوتا بھی نہیں

ساغرؔ اِک مدّت سے چُپ چُپ
ہنستا بی نہیں روتا بھی نہیں

وقت کے ہاتھوں زلیخا لٹ گئی
کیوں نہ ہو یہ مصر کا بازار چیز

وہ میری ہاں کا عادی ہو چکا ہے
اُسے کہہ دو مرا انکار دیکھے

بکھری ہوئی تھی زلف جہانِ خیال کی
اردو زباں نے اس کو سنوارا حسیں کیا

غزل

خود سے خود ہی سوال کرتے ہیں
اور پھر عرضِ حال کرتے ہیں

جب بھی اُنکا خیال کرتے ہیں
ہجر کو ہم وصال کرتے ہیں

میرے ہونے کا اور نہ ہونے کا
مجھ سے بچے سوال کرتے ہیں

رنگ بدلے ہیں موسموں کی طرح
اہلِ ثروّت کمال کرتے ہیں

سرد جھونکا ہوا کا جب آئے
اہتمامِ وصال کرتے ہیں

پست اِنسانیت کی عظمت کو
سرحدوں کے یہ جال کرتے ہیں

پیڑ نفرت کے کاٹ آ ساغرؔ
کام کچھ لازوال کرتے ہیں

غزل

میرا دل تِتلی کا پَر ہے
ساری دُنیا میرا گھر ہے

عشق جِسے کہتے ہیں اُس کی
پہلی سیڑھی زخمِ جگر ہے

گونگی بہری اِس بستی میں
تیری صدا بے بال و پر ہے

ہونٹوں پر ہے مہر خموشی
آنکھوں میں منظر منظر ہے

شیش محل میں رہنے والا
ہاتھوں میں لے کر پتھر ہے؟

ویرانی ہے ویرانی سی
شاید یہ میرا ہی گھر ہے

مُجھ سے مسیحا پوچھ رہا ہے
زخم کِدھر ہے درد کِدھر ہے

میں تو ہوں بیمارِ محبت
میں کیا جانوں درد کِدھر ہے

ساری بستی پتھر پتھر
کانچ کا اِس میں اِک ساغرؔ ہے

☆

قطعہ

نیند آئے گی وقت سوئے گا
جب اُٹھے گا تو زخم دھوئے گا
ہم جو تاریخ جی رہے ہیں آج
جب بھی کوئی پڑھے گا روئے گا

☆

نصیب میں جو ترے ہے عذاب آئے گا
اور اُس کے بعد نیا آفتاب آئے گا
اُٹھائی ظُلم کی دیوار جس نے بھی اُس کا
یقین کیجئے یومِ حساب آئے گا

☆

غزل

منزلِ عشق طے کریں گے ہم
اُس سے پہلے کہاں مریں گے ہم

خود سے مِلنے کے بعد سوچا ہے
جستجوئے خُدا کریں گے ہم

ہم ہیں گُل گلشنِ زُلیخا کے
حُسن پر نذرِ جاں کریں گے ہم

شیش محلوں میں ہم نہیں رہتے
سنگ باری سے کیوں ڈریں گے ہم

ایک قطرہ بہت ہے ساغرؔ کو
جام پہ جام کیوں بھریں گے ہم

کوئی پل بھی تجھے بھولا نہیں ہوں
اکیلا ہوں مگر تنہا نہیں ہوں

غزل

منظر زندہ تھے میری بینائی تک
شہرت ساتھ رہی میری رسوائی تک

بستی چھوڑ کے صحرا میں آ بیٹھا تھا
یاد تری آئی میری تنہائی تک

تم کو تو غیروں نے بھی اپنایا ہے
ہم سے ہیں ناراض ہمارے بھائی تک

ہم نے جنوں کی سرحد تک کو پار کِیا
آپ رہے محدود فقط دانائی تک

راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے چیخنے لگتے ہیں
بچوں نے چڑیا جب کہ دفنائی تک

خوشیوں کے جو گیت سُنایا کرتی تھی
لوگوں نے دفنا دی وہ شہنائی تک

جھیل کی گہری آنکھ کا پانی سوکھ گیا
جب تک اُترے ہم اِس کی گہرائی تک

پوچھ رہے ہیں تشنہ لب اِک دوجے سے
دریا کب پہنچا ساغرؔ صحرائی تک

غزل

تُجھ پہ ہر راز ہے عیاں پھر بھی
لے لِیا میرا امتحاں پھر بھی!

حوصلے برق کے جواں پھر بھی
ہم بنائیں گے آشیاں پھر بھی

میں کہ ہر سانس بے حِسی کا شکار
وہ کہ ہر گام مہرباں پھر بھی

لُٹ گئے ہم خلوص کے ہاتھوں
ہم سے مِلتے رہو میاں پھر بھی

اُس کے حق میں دیا بیاں ہم نے
کاٹ ڈالی مری زباں پھر بھی

یوں بظاہر کہیں نہیں موجود
ہے مگر وہ یہاں وہاں پھر بھی

یوں تو رہتی ہے شب کے سینے میں
کِتنی رنگیں ہے کہکشاں پھر بھی

سب زمینوں نے مُجھ کو چھوڑ دِیا
میرے سر پر ہے آسماں پھر بھی

ہم تو سب کُچھ لُٹا چُکے ساغرؔ
شخص وہ بدگُماں پھر بھی

☆

قطعہ

اعترافِ وفا گنہہٗ ہے آج
جُرم ہے واجبِ سزا ہے آج
خواہشوں کے ہجوم میں اِنساں
اپنی پہچان کھو چُکا ہے آج

☆

گہرے گہرے رات کے سائے
یادوں کی بارات کے سائے
ڈستے ہیں نغمے بن بن کر
شام و سحر حالات کے سائے

☆

غزل

جس کے دِل میں خُدا اُترتا ہے
آزمائش سے کیوں گُذرتا ہے

وقت ہے پھر بھی کوئی وقت نہیں
بس یونہی کارواں گُذرتا ہے

دِل کی دُنیا کا ذکر بے معنی
کوئی دِل میں کہاں اُترتا ہے

تری خوشیوں کا یہ حسیں جھونکا
میرے آنگن سے کیوں گُذرتا ہے

پنچھیوں سے کہو کہ لوٹ آئیں
کون اِتنی اُڑان بھرتا ہے

پاگل گلیوں کوچوں اپنوں غیروں میں بدنام
مجنوں وحشی ساحر صحرائی

ــ دے گا سوا پیاس تیری عقل کا صحرا
وہ اِس راہ میں جتنے بھی ہیں سب بے آب ہیں دریا

غزل

یوں طویل اکثر لگے ہم کو مگر
مختصر ہے زندگانی کا سفر

رازِ ہستی سے رہا وہ بے خبر!
جھک گیا جو نفس کی دہلیز پر

سوزشِ دِل کو ہے ٹھنڈک اوس کی
اِک نظر بس اِک نظر بس اِک نظر

ثبت ہیں جس پر ترے نقشِ قدم
قابلِ تعظیم ہے وہ رہگذر!

وقت کے حکام سے اُمید خیر
اِس سے بہتر ہے پٹک پتھر پہ سر

ہم قبا پہنے ہوئے اُمید کی
مُنتظر ہیں مُنتظر اے مُنتظَر

کوئی ساغرؔ کو سمجھ پاتا نہیں
یوں سبھی کہتے ہیں کچھ اِرشاد کر

غزل

زندگی نزدیک بھی ہے دُور بھی
اور ہم مختار بھی مجبور بھی

پہلے بے گھر کر دِیا اور اُس کے بعد
بے وفا مُجھ کو کِیا مشہور بھی

کر سکے پیدا تو کر تابِ نظر
ورنہ جلوے سے جلے ہے طور بھی

عشق میں مر مِٹ کے لافانی ہوئے
سرمد و طبریز بھی منصوّر بھی

پر کٹے پنچھی کی صورت ہم سبھی
ہیں یہاں آزاد بھی محصور بھی

ڈنس نہ لے تیرے سکونِ قلب کو
ہوش کر دولت ہے اِک ناسور بھی

ہے کٹھن ساغرؔ راہِ اُلفت مگر
روح کو کرتی یہ مسرور بھی

غزل

آنسوؤں سے درد کو سہلائیں گے
ہم غموں کو اِس طرح بہلائیں گے

اِمتحاں اور رہروانِ شوق کا
مُسکرا کر دار پر چڑھ جائیں گے

قیس مجنوں ہو گیا رانجھا فقیر
یہ کہانی پھر سے ہم دہرائیں گے

جب کبھی پائیں گے یہ اپنا سراغ
لوگ اپنے آپ سے شرمائیں گے

مِل بھی جائے وہ کبھی پھر سے اگر
زخمِ تنہائی کے کب بھر آئیں گے

کھو گیا ساغرؔ میں صحرائی تمام
ڈھونڈ کر ہم ہی اُسے لے آئیں گے

ٹھہر سی گئی گردشِ زمانہ جب
میرے محبوب بام پر آئے

قابلِ تعظیم انساں کا وجود
ہے اِسی خستہ مکاں میں لامکاں

غزل

مری صبح تُو ہے مری شام تُو ہے
ترا ذکر ہی میرا جام و سبو ہے

تُو خوشبو کا دِل ہے گلابوں کی بو ہے
تری آرزو ہے تری آرزو ہے

مسافر تو ہم زندگی کے ہیں لیکن
حقیقت میں اپنی ہمیں جستجو ہے

کِیا داغ ہے جِس نے انسانیت کو
یہ کِس نے بہایا یہ کِس کا لہو ہے

یہاں پر لُٹی یا وہاں پر لُٹی جو
مری آبرو یا تری آبرو ہے

سنبھل کر چلو وادیِ زندگی کا
سفر ہے کہ اِک آتشیں آبِ جُو ہے

نظر ہو گئی میری بالغ ہے شائد
"جِدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تُو ہے"

بچائے رہو کِبر سے خود کو ساغرؔ
ازل سے یہ انسانیت کا عدو ہے

غزل

کر دے گا سوا پیاس تری عقل کا صحرا
اِس راہ میں جتنے بھی ہیں بے آب ہیں دریا

پانی نچوڑ پی گئے اُونچے درخت سب
پودے تھے گلستاں میں جو رکھا اُنہیں پیاسا

کہتے ہیں خُدا جنکو وہی ذات ہے شائد
جو پالتا ہے سنگ کی آغوش میں کیڑا

ہر در سے لوٹ آئی ہے آواز بار بار
لگتا ہے کہ اِس شہر میں ہر شخص ہے بہرا

تُجھ کو اگر تلاش ہے رازِ حیات کی
جا ڈوب جو مِل جائے کہیں عشق کا دریا

شرمندۂ تعبیر بھی ہو جائے گا ساغرؔ
اِس بار وہی خواب جو دیکھا ہے سنہرا

غزل

محبت کو جو محترم دیکھتے ہیں
ستم پر ستم ہر قدم دیکھتے ہیں

کرے پیرہن چاک سنیاس لے لے
اگر کوئی دیکھے جو ہم دیکھتے ہیں

لئے سر پر اِلزام آوارگی کا
''تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں''

جفاؤں کے شُعلے وفاؤں کی شبنم
چلو کِس میں کِتنا ہے دم دیکھتے ہیں

منوّر ہیں دِل جِن کے علم و ہُنر سے
اُنہیں چیختے لوگ کم دیکھتے ہیں

اگرچہ گناہوں میں ڈوبے ہیں ساغرؔ
پر الطافِ خیرالُامم دیکھتے ہیں

غزل

جُرم جینا بھی جُرم مرنا بھی
ہونٹ سینا بھی بات کرنا بھی

وقت نے دِن بدل دیئے تیرے
اے مرے دوست اِس سے ڈرنا بھی

یوں بکھیرو نہ خار راہوں میں
اِن سے کل ہے تمہیں گذرنا بھی

جتنے زینے چڑھو چڑھو لیکن
سوچ لو ہے کبھی اُترنا بھی

جستجو میں تری ہیں سب مشغول
چاند تارے بھی جھیل جھرنا بھی

آج قسمت کی زُلف اُلجھی ہے
کل ہے ساغرؔ اِسے سنورنا بھی

ذکر اور فکر کا تقاضہ ہے
خامشی اِختیار کی جائے

میرا دِل تتلی کا پَر ہے
ساری دُنیا میرا گھر ہے

غزل

سچ کے ہونٹوں کو سی لِیا جائے
ہم سے ایسا نہ کُچھ کِیا جائے

دِل دِیا جائے دِل دِیا جائے
اور ہونٹوں کو سی لِیا جائے

بھول جاتے ہیں مِل کے جو اکثر
یاد پھر کیوں اُنہیں کِیا جائے

خونِ آدم سے لاکھ بہتر ہے
سُرخ پانی ہی پی لِیا جائے

نفسا نفسی کا ایک عالم ہے
کِس سے کِس کا پتہ کِیا جائے

خوشبوئیں قید ہو نہیں سکتیں
خوشبوؤں کو اُڑا لِیا جائے

بات کرتا ہے حق کی صحرائیؔ
اُس کو سولی چڑھا لِیا جائے

غزل

راہِ وفا میں رکھ کے ہتھیلی پہ سر چلو
منزل ملے ملے نہ ملے تم مگر چلو

اِک روز ڈوب جائے گی یہ کشتیِ حیات
گہرے سمندروں میں ذرا دیکھ کر چلو

صحرا میں حسرتوں کے بھٹکنے سے ہے بہتر
رختِ سفر سمیٹ لو اور اپنے گھر چلو

ہر اِک قدم پہ جال بچھے ہیں فریب کے
دامن بچاؤ رکھ کے ہتھیلی پہ سر چلو

ہم آپ ہی کے نام کریں گے یہ زندگی
راہِ وفا میں ایک قدم ساتھ گر چلو

ساغرؔ کو دیکھ دوست بھی سرگوشیاں کریں
سچ بولتا ہے اِس سے بچا کر نظر چلو

گونگی بستی بہرے لوگ
ہم خمر سب بے چہرے لوگ

کسی کی سوچ کیوں ہو سوچ میری
مرا سر تو ابھی میرا ہی سر ہے

غزل

غم میں خوشیوں کے گیت گاتا ہوں
روتے روتے بھی مُسکراتا ہوں

جن کے سائے میں ہم مِلے تھے کبھی
اُن درختوں کے گیت گاتا ہوں

جن پہ مِلتے ہیں تیرے نقشِ قدم
ایسے پتھر گلے لگاتا ہوں

درد دِل کا کہیں نہ سو جائے
چوٹ پر چوٹ کھائے جاتا ہوں

حسرتوں کو اُمید کی لوری
میں سُناتا ہوں اور سُلاتا ہوں

تُجھ کو رسوا کرے نہ میرا جنوں
لے ترے شہر سے ہی جاتا ہوں

جب خوشی کی ندی اُترتی ہے
غم کے ساغرؔ میں ڈوب جاتا ہوں

غزل

وعدۂ وصل کا آسرا چاہیے
روشنی کے لئے اِک دیا چاہیے

آئینہ چاہیے آئینہ چاہیے
ہم کو ہم سا کوئی دوسرا چاہیے

دِل دیا جاں دی اپنی پہچان دی
زندگی اب تجھے اور کیا چاہیے

منزلیں تو دِکھاتی ہیں وحشت بہت
منزلوں کے لئے راستہ چاہیے

بات اپنی سُنانے میں کیا حرج ہے
اور کی بھی مگر کُچھ سُنا چاہیے

موت کو ہر قدم زیست کی جستجو
زیست کو ہر نفس کربلا چاہیے

جس کی لو سے کِسی سر کا آنچل جلے
ایسے ظالم دیئے کو ہوا چاہیے

ایک مدّت سے ویراں ہے دِل کا نگر
یہ بسا چاہیے اب بسا چاہیے

یوں ہی جینے کا ساغرؔ مزا کچھ نہیں
دردِ جس سے بڑھے وہ دوا چاہیے

☆

قطعہ

گھر کے سارے زیور لینا
افسر کو جا کر دے دینا
ورنہ جوتے گھس جائیں گے
پھر بھی کام بنے تو کہنا

☆

میرؔ و غالبؔ کی زُباں اُردو زباں
غور سے سُن لیجئے اے مہرباں
کہہ گئے فیضؔ و جگرؔ جیسے کئی
وقت آئے گا چھوئے گی آسماں

☆

کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے
یہ بھی ہوتا ہے وُہ بھی ہوتا ہے
کیوں پریشاں ہو وقت آنے پر
یہ بھی سوتا ہے وُہ بھی سوتا ہے

☆

غزل

جفا کاروں کو احساسِ وفا دے
فقیرِ شہر بس اِتنی دُعا دے

خُدا منصف کو اِتنا حوصلہ دے
مُجھے بخشے تو پھر خود کو سزا دے

دُعائیں زندگی کی دینے والے
مُجھے جینے کا پہلے حوصلہ دے

سمندر مدتوں سے تشنہ لب ہے
کوئی آئے اِسے پانی پلا دے

میں اب اخبار پڑھ کر تھک چُکا ہوں
خبر اِک امن کی کوئی سُنا دے

سرِ مقتل ہے اِتنی بھیڑ ساغرؔ
کہ اِک پل میں دکھائی دوسرا دے

غزل

جو بھی صحرائے حق میں بھٹکتا رہا
وہ زمانے کے دِل میں کھٹکتا رہا

لمحہ لمحہ کے پیچھے بھٹکتا رہا!
وقت ہر وقت دامن جھٹکتا رہا

اِس یقیں پر بہاریں پلٹ آئیں گی
شاخِ اُمید سے میں لٹکتا رہا

اُن کے آنے کی ہم نے سُنی تھی خبر
آنکھ رستہ بنی دِل دھڑکتا رہا

یوں تو ساغرؔ کو سب نے لگایا گلے
بن کے کانٹا نظر میں کھٹکتا رہا

کل رات وہ محفل چھوڑ گیا
کل رات بہت برسات ہوئی

عقل کو ہم نے جب شعور کیا
من و تو کا جہاں عبور کیا

وادی ڈوبی ہے اشکوں میں
وہ سمجھے برسات ہوئی ہے

غزل

ایسا کریں گے اور پھر ویسا کریں گے ہم
کِتنے حسین خواب تھے سوچا کریں گے ہم

گیسو و خوشبویں وہ نگاہیں وہ مستیاں
جب جب بھی یاد آئیں گی تڑپا کریں گے ہم

صدیوں کا کرب لے لِیا لمحات کے عوض
اب اِس سے بڑے کے اور کیا سودا کریں گے ہم

اِک روز شہر زندگی جانا ہے چھوڑ کر
گر ہو گئے اِسی کے تو پھر کیا کریں گے ہم

ڈس لیں گے غم کے ناگ مداری کو ایک دِن
ساغرؔ یقین ہے کہ تماشا کریں گے ہم

ثمر تو بھول سکتا ہے شجر کو
شجر بھولے مگر کیسے ثمر کو

اُدھر بے چین ہیں پنچھی اِدھر بھی
ستمگر صیاد بھی دیوار پر ہے

کہاں سے لاؤں وہ ماں کا آنچل
وہ نیند خوشبو وہ خواب خوشبو

غزل

سامنے جب تُمہارا گھر آئے
اور کُچھ بھی نہ پھر نظر آئے

کِتنے سورج اُبھر کے ڈوب گئے
کب کوئی جا کے لوٹ کر آئے

تھم گئی گردشِ زمانہ جب
میرے محبوب بام پر آئے

منزلیں بانٹ لیں زمانے نے
میرے حصے میں بس سفر آئے

ختم ہو جائے جب سفر میرا
پھر سے تیری ہی رہگذر آئے

راہ زن لے کے ہاتھ میں خنجر
مانگنے بھیک دربدر آئے

تبصرے ہو رہے ہیں مقتل میں
آج نیزے پہ کِس کا سر آئے

تیرے قدموں کو کیا ہوا ساغرؔ
چھوڑ کر کیوں وہ رہگذر آئیے

غزل

زندگی دیوار ہونے دیجئے
موت سے اِنکار ہونے دیجئے

روح کی تعظیم وعظمت کے لئے
عقل کو بیمار ہونے دیجئے

پیار کا دریا ہے دریائے حیات
وقت کو تلوار ہونے دیجئے

اِس سے پہلے غرق ہو اِنسانیت
میری کشتی پار ہونے دیجئے

ماہ و انجم سے لگیں گے لفظ لفظ
فِکر کو شاہکار ہونے دیجئے

پیار سے تخلیق ہے یہ کائنات
نفرتوں کو پیار ہونے دیجئے

بخش دوں صحرائی کو اُس کا مقام
سر مرا دستار ہونے دیجئے

غزل

یہ دُنیا شکستوں کا اِک کارواں ہے
یہاں ہر قدم پر نئی داستاں ہے

لُٹاتے ہیں سب کُچھ جو اوروں کی خاطر
اُنہی کے لئے زندگی اِمتحاں ہے

یہاں جیت کر ہار جائے جو بازی
اُسی سے زمانہ یہاں بدگُماں ہے

ادھر عشق آتش اُدھر حرص شعلے
کوئی صاحبِ دل جلے درمیاں ہے

یہ بازارِ ہستی ہے بازار ایسا
جہاں سود میں بھی زیاں ہی زیاں ہے

ہوئے کیا دِل افروز منظر وہ ساغرؔ!
ترے شہر میں اب دھواں ہی دھواں ہے

غزل

دُور جنگل میں ایک میلا ہے
شہر میں ہر کوئی اکیلا ہے

زندگی کھا گئی جوانی کو
بچپنے نے عذاب جھیلا ہے

آج دار و رسن کی زیبائش
کوئی نرگس ہے کوئی بیلا ہے

نیند لاکھوں برس پُرانی ہے
اور سپنا نیا نویلا ہے

کِتنی تنہا ہے ناؤ کاغذ کی
ہر طرف بارشوں کا ریلا ہے

ساتھ میرے ہجوم کا آسیب
اور ساغرؔ سفر اکیلا ہے

غزل

مرے خوابوں میں تُو ہے اور میں ہوں
تری ہی جستجو ہے اور میں ہوں

سفر ہے تشنگی ہے جستجو ہے
اُمیدوں کا سبّو ہے اور میں ہوں

مرے ہونٹوں پہ ہُو ہے اور میں ہوں
یہ کوئی آرزو ہے اور میں ہوں

مری آوارگی ہے اور تُو ہے!
مسافت روبرو ہے اور میں ہوں

جنہیں ہے امن کا دعویٰ کہاں ہیں
یہاں میرا لہو ہے اور میں ہوں

وفائیں مری بے وفاؤں کے نام
مری یہ دُعا بد دُعاؤں کے نام

جن کے لیے تاراج ہوئے ہم
ہم کو انہی پیام میں دیکھ

خدا کے گھر تو یوں جاتا ہے ساغر
کبھی ہمراہ دل جائے تو مانوں

غزل

دِل کی بستی میں راہ گیر کوئی
شہرِ آشوب میں سفیر کوئی

دِل کے آنگن میں درد یوں جیسے
تختِ شاہی پہ ہو فقیر کوئی

وادیِ جسم اور میرا سفر
جیسے جنگل میں راہ گیر کوئی

جسم آوارہ اور روح محتاج
ہائے مجرم کوئی اسیر کوئی

چاندنی میرے دِل کے آنگن میں
یوں اُترتی ہے جیسے تیر کوئی

رشتہ؂ درد ہی وہ رشتہ ہے
جس کی ساغرؔ نہیں نظیر کوئی

غزل

کہاں سے پائے گا تُو رازِ کائنات ابھی
محیط تُجھ کو کِئے ہے حصارِ ذات ابھی

سفر حیات کا طے کر رہا ہوں صدیوں سے
سمجھ سکا نہ مگر مقصدِ حیات ابھی

زباں کی زد پہ تو روشن ہے کلمہ ءِ توحید
بسے ہیں دِل میں ترے لات ابھی منات ابھی

خرد تو چند اِشاروں سے ہو گئی لرزاں
جنوں کے ہاتھ میں ہیں کِتنے حادثات ابھی

میں اِک چراغ ہوں گرچہ ہوں ظُلمتوں کا اسیر
مُجھے بھی جلنے دو چھائی ہے مُجھ پہ رات ابھی

جہانِ سود و زیاں سے پرے ہوں اے ساغرؔ
نہ کر سکے ہیں ابھی سَر یہ طِلسمات ابھی

غزل

ہائے اسیر ذات ہوئی ہے
نسلِ آدم مات ہوئی ہے

بستی سے سب بھاگ رہے ہیں
آخر کُچھ تو بات ہوئی ہے

سناٹا ہے شہر میں ایسا
جیسے دِن میں رات ہوئی ہے

وادی ڈوبی ہے اشکوں میں
وہ سمجھے برسات ہوئی ہے

اپنے صبر کی بات نہ پوچھو
رنج و الم کو مات ہوئی ہے

کل شب نیند پڑی تھی ہم کو
کل ہی اُن سے بات ہوئی ہے

ساغرؔ اب یہ دِل کی وادی
میدانِ عرفات ہوئی ہے

غزل

یوں تو مظلومیت کا پرچم ہوں
زخم خوردہ ہوں پھر بھی پُردم ہوں

پڑھ سکو گے تو مُجھ کو پڑھ لینا
ظُلم کی اِک کتابِ ماتم ہوں

ایک شُعلہ ہوں مُجھ سے گر اُلجھو
جو قریب آؤ گے تو شبنم ہوں

ہے غمِ کائنات غم میرا
اپنی خاطر کہاں میں پُرنم ہوں

میرے ناموس کے لئے جو بہا
اُس لہو کا میں سُرخ پرچم ہوں

ریزہ ریزہ وجود ہے پھر بھی
شوقِ منزل ہے اور پُردم ہوں

وہ سزا دے کے چھوڑ دے مُجھ کو
فیصلے پر میں اُس کے سرخم ہوں

غزل

سفر کیا آرزوؤں کا سفر ہے
بڑا پُرلطف لیکن پُرخطر ہے

یہ کیسا دور ہے یہ دور کیسا
خُدائے نسلِ آدم مال و زر ہے

جو بچ نکلے وہ مردِ حُر ہے ورنہ
بہت رنگیں گُناہوں کی ڈگر ہے

مُجھے تنہائیاں راس آ گئی ہیں
یہ ویراں دشت ہے یا میرا گھر ہے

میں خود کو ڈھونڈ ہی لیتا کروں کیا
سفر ہی زندگی کا مختصر ہے

یہاں آئے بھی کوئی اور کیونکر
دلِ ساغرؔ تری یادوں کا گھر ہے

غزل

موت کے تاجر کہے ہیں زندگی کی بات کر
رنج و غم دیتے ہیں کہتے ہیں خوشی کی بات کر

چھین کر میری نگاہیں حُکم یہ صادر کِیا
بھول جا تاریکیوں کو روشنی کی بات کر

اے مسافر موسموں کی دھوپ چھاؤں کو پرکھ
پھر کِسی موسم سے اپنی دِل لگی کی بات کر

عہدِ نو باطل کی زنجیروں میں ہے جکڑا ہوا
تُجھ کو جینا ہے تو حق سے بے رُخی کی بات کر

آ ہمارے شہر میں دو روز رقصِ موت دیکھ
پھر اگر چاہے تو امن و آشتی کی بات کر

ساغرِ صحرائی کی شعلہ نوائی پر نہ جا
اُس سراپا درد کی بیچارگی کی بات کر

جلوۂ طور اور دمِ عیسیٰ
عشق کے ہاتھ کا اک زینہ ہے

سچ گواہوں کا ہو گیا محتاج
کر گیا جھوٹ معتبر مجھ کو

غزل

سُکھ کیا ہے کبھی دیکھا ہی نہیں
دُکھ سے میں کبھی اُلجھا ہی نہیں

اِک عمر رہا کھویا کھویا
میں نے خود کو سوچا ہی نہیں

تھا نور کا چرچا ہر جانب
سورج میں نے دیکھا ہی نہیں

ہاتھوں میں منازل کا دامن
اور پیروں میں رستہ ہی نہیں

تریاق لئے بیٹھے ہیں سب
پر سانپ مُجھے ڈستا ہی نہیں

برسات گنہہ کی ہونے دے
دامن تو ابھی بھیگا ہی نہیں

سُلجھا دے گا ساری اُلجھن
دیوانہ ابھی اُلجھا ہی نہیں

ہم ایسے دیوانے ساغرؔ
سب کا ہے پتہ اپنا ہی نہیں

غزل

اہلِ دِل بے شُمار دیکھے ہیں
ہاں مگر اشک بار دیکھے ہیں

قہقہوں کے ہجوم میں ہم نے
حسرتوں کے مزار دیکھے ہیں

پیٹ کی بھوک کے لئے بکتے
حُسن کے شاہکار دیکھے ہیں

لوٹتے ہیں کفن جو لاشوں کا
ہم نے وہ شہریار دیکھے ہیں

آدمی آدمی کو کہتے ہوئے
ہم نے پروردگار دیکھے ہیں

سچ کے دیوانے ہم نے اے ساغرؔ
روز وشب بے قرار دیکھے ہیں

ساری بستی پتھر پتھر پتھر
کانچ کا جس میں اک ساغر ہے

پانی پانی کر رہے تھے تشنہ لب
حادثے دریا کنارے ہو گئے

غزل

وصل کی رات کو سراب کہیں
یا کہ مجنوں کا کوئی خواب کہیں

گھر جلا کر کِیا جہاں روشن
اب گہنہ یا اسے ثواب کہیں

جھیل سی مست گہری آنکھوں کو
مکیدہ یا شرابِ ناب کہیں

اب تو چہرے بدلتے رہتے ہیں
کیسے دل کی اُنہیں کتاب کہیں

ہم وہی ہیں وہی رہیں گے بھی
جو بھی چاہیں ہمیں جَناب کہیں

حشر برپا ہے چار سو ساغرؔ
اب کِسے عرصۂِ حساب کہیں

غزل

کوئی لمحہ تجھے قرار نہیں
زندگی تیرا اعتبار نہیں

بند ہم نے کیئے ہیں دِل کے کیواڑ
اب کِسی کا بھی اِنتظار نہیں

کوئی اپنا کہیں نہیں شاید
ہم کو شاید کِسی سے پیار نہیں

تُو ہی تُو اور کُچھ نہیں مطلوب
موسمِ گُل نہیں بہار نہیں

خود کو لوگوں میں ہم نے بانٹ لِیا
اب ہمیں خود پہ اختیار نہیں

ہم کہ سُولی پہ چڑھ گئے ساغرؔ
اور یہ وقت بے قرار نہیں

غزل

اُن کے ہونٹوں پہ یہ دُعا ہو گی
بے گناہوں کو کب سزا ہو گی

میری خاطر وہی ضیا ہو گی
جس میں پنہاں تری رضا ہو گی

میرا قد آسماں کو چھُو لے گا
دوستو جب فناہ انا ہو گی

چھین لی تُو نے جو سرِ بازار
تیرے گھر میں بھی وُہ رِدا ہوگی

میری ہر سانس سانس میری نماز
کون کہتا ہے یہ قضا ہوگی

درد جس نے دِیا اُسی کے ہاتھ
میرے ہر درد کی دوا ہو گی

بزم و خلوت میں بات ساغرؔ کی
جو بھی ہوگی وُہ برملا ہو گی

غزل

اُندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا ہے
مُجھے جگنو کوئی یاد آ رہا ہے

سفر معراج اپنی پا رہا ہے
مسافر سوئے مقتل جا رہا ہے

خموشی، خوف، سناٹا اُداسی
بھری بستی میں دِل گھبرا رہا ہے

اندھیری رات ہے کوئی مسافر
جُدائی کے ترانے گا رہا ہے

شجر سایہ فگن اوروں پہ اور خود
کڑکتی دھوپ میں جلتا رہا ہے

کہیں ساغرؔ کو تُم شاعر نہ کہنا
وہ اپنی داستاں کہتا رہا ہے

پھر اُن کے کنارے کوئی گھر کیسے بساتا
بستی اُجاڑ کر بھی جو دریا چڑھے رہے

لکھ گیا ساغرؔ کوئی صحرا کی بھیگی ریت پر
ہم نے جِس کو دِل دیا اُس نے ہمیں صحرا دیا

غزل

جنونِ عشق کب عقل و خرد کے زیرِ دام آیا
اگر آیا تو پھر منزل سے بے نیل مرام آیا

"مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا"
شبِ تاریک کے سینے میں جینے کا مقام آیا

ہیں محتاجِ نظر سب مکیدے اُس ایک میکش کے
کہ جس کے ہاتھ آہِ صبح گاہی کا ہو جام آیا

اُجالے میری راہوں میں قدم بوسی کو دوڑ آئے
اندھیری منزلوں میں جب لبوں پہ تیرا نام آیا

وہ نرگس چشم، تن مشکِ ختن، وہ کاکلِ سُنبل
مرے حصّے میں اے ساقی ترا عشقِ دوام آیا

جلیں اُمید کی شمعیں مری بے نور آنکھوں میں
تصّور میرے دِل میں جب ترا اے خوشخرام آیا

تو اپنی تشنگی کو اپنی قسمت جان لے ساغرؔ
سکندر چشمہ ٭ حیواں پہ پہنچا، تشنہ کام آیا

غزل

یہاں جائے وہاں جائے مُسافر
بِنا منزل کہاں جائے مُسافر

اُتر جائے جو اپنے قلب میں تو
زمیں تا آسماں جائے مُسافر

ورق پلٹے ہے جب جب زندگی کے
بدلتا ہی بیاں جائے مُسافر

جہاں خنجر بکف ہوں سارے موسم
کِدھر جائے کہاں جائے مُسافر

لہو روتی ہے ارمانوں کی بستی
کہ جب اُٹھ کر جواں جائے مُسافر

تمناؤں کا پنچھی ہم سفر ہے
جہاں جائے جہاں جائے مُسافر

مقفل پیار کے سب میکدے ہیں
لئے ساغرؔ کہاں جائے مُسافر

غزل

جامِ وحشت پلائے تو کیا کیجئے
یاد تیری جو آئے تو کیا کیجئے

گُل کھلے کھِل رہے ہیں چمن در چمن
تیری خوشبو نہ آئے تو کیا کیجئے

زہرِ غم میں بُجھے تیر لاکھوں لگے
موت دامن بچائے تو کیا کیجئے

کوئی طبریز یا کوئی سَرمد کہیں
تیرا پردہ اُٹھائے تو کیا کیجئے

مُفلسی، بے بسی، رنج و احساس کو
گھر ترا راس آئے تو کیا کیجئے

ساقیا عشق کی مے کا مارا ہوں میں
تُجھ پہ اِلزام آئے تو کیا کیجئے

مے سے ساغرؔ کی وابستگی عینِ حق
اُس پہ بھی حرف آئے تو کیا کیجئے

غزل

زمانہ، ہماری اگر بات مانے
لوٹائیں گے ہم حسرتوں کے خزانے

لہو سرد حرص و ہوس، نفسی نفسی
ہیں تہذیب نو کے نئے شاخسانے

مسافت اذیت کے لمحوں کی توبہ
گُذرتے ہیں لمحوں میں سو سو زمانے

جنہیں خود بھی جینے کی سدھ بُدھ نہیں ہے
چلے ہیں وہ آدابِ ہستی سکھانے

نئے کربلا کی لئے دِل میں حسرت
چلا کوئی ساغر سر اپنا کٹانے

☆

قطعہ

مرا پیغام ساغرؔ مشتہر ہر جا کیا جائے
ہر اک پیروجواں سے بس یہی وعدہ لیا جائے
یہ درویشوں فقیروں حق پرستوں کی ریاست ہے
مرے کشمیر کو کشمیر ہی رہنے دیا جائے

غزل

زندگی کی تمنا سزا ہوگئی
دِل سے نِکل دُعا بددُعا ہوگئی

اِبتداء میں ہی اِس درجہ رسوائیاں
اِنتہا ہوگئی اِنتہا ہوگئی

پیاس کی جستجو میں سمندر چلے
زندگی موت کا نقشِ پا ہوگئی

ہم نے نوکِ قلم میں چھپایا جِسے
مشتہر وہ غزل جا بجا ہوگئی

بیج پھولوں کے بوئے تو کانٹے اُگے
کاوشِ باغباں کیا سے کیا ہوگئی

شہرِ آشوب میں جستجوئے سکوں
ہائے ساغرؔ سزا در سزا ہوگئی

پتھروں کے شہر میں احساس کا مارا ہوا
ہوگیا ہے کوئی ساغرؔ بے زباں کیسے کہوں

مشکلوں سے ملا تھا گھر مجھ کو
لے اڑا پھر کوئی سفر مجھ کو

غزل

عشق ہے بے قرار ساون میں
ہے کٹھن اِنتظار ساون میں

ہر کلی پر نِکھار ساون میں
ایک ہم بے بہار ساون میں

شامِ غم اور یہ سِتم اُس پر
دُور ہم سے ہے یار ساون میں

چشمِ ویراں جُدائی میں تیری
بن گئی آبشار ساون میں

دِل کو سمجھائے یا زمانے کو
پائے مجبور پیار ساون میں

میں جوانی کی ان بہاروں کو
تُجھ پہ کرلوں نثار ساون میں

پھر سے ساغرؔ شباب جھوم اُٹھے
کاش مِل جائے یار ساون میں

غزل

جو دِل سے کام لوں تو خاک کو اکثیر کر ڈالوں
اندھیری بستیوں کو وادیِ تنویر کر ڈالوں

تقاضہ کر رہے ہیں بوالہوس احباب یہ مُجھ سے
ارادوں کو میں اپنے تابعِ* زنجیر کر ڈالوں

ڈبو دوں آنسوں میں اہلِ دِل کو داستاں کہہ کر
زمانے کو میں سارے وادیِ کشمیر کر ڈالوں

ہوئی اِنسانیت صدیوں کو بوڑھی دیکھتے جِن کو
میں اُن خوابوں کی دے کر خونِ دِل تعبیر کر ڈالوں

جو ساغرؔ بس چلے تو بانٹ کر میں اپنے جذبوں کو
سبھی پیرو جواں کو وقت کا شبیر کر ڈالوں

راز کوئی کھل گیا ہم پیدا
تیرے آنے میں تیرے جانے میں

ڈھونڈتے ڈھونڈتے آستانِ سکوں
بجے بی میری ویلم پیدا سو گئی

یہ سفر نظروں کا ہائے شوقِ دید
پیدا کر گئے آنکھوں میں چھالے زندگی

غزل

کِسی کی یاد آئی ہم جِگر تھامے لہو روئے
ہماری بے بسی دیکھی تو احباب و عدو روئے

اُداسی، بے قراری، بے کلی، ہر سمت ویرانی
یہ کِس کا غم ہے، کِس کے غم میں یہ جام وسبّو روئے

گُذاری زندگانی فقر سے رہ کر پرے لیکن
ہوئے رخصت تو ہم اعمال پر اپنے لہو روئے

کہیں یوں بے ارادا ہم سے گُستاخی نہ ہو سرزد
اِسی خاطر جو ہم روئے ہمیشہ باوضو روئے

اگر شرمندۂ تعبیر ساغرؔ خواب ہوں اپنے
نہ گُل روئے نہ بُلبل، اور نہ شمشاد و سرو روئے

غزل

مدتوں سے یہ دُنیا ہے محوِ سفر
اب بہت جلد پہنچے گی انجام پر

قلبِ انساں نے یوں کھو دیا ہے سکوں
روح جیسے اُڑے ہے بدن چھوڑ کر

اُن کی محفل سے ایسے نِکل آئے ہم
جیسے آنکھوں سے بہتے ہیں لعل و گُہر

جِس نے بھی اپنا غم مشتہر کر دیا
وہ خوشی کو ترستا رہا عُمر بھر

وقت کی ظلمتوں سے نہ گھبرایئے
سینہ ؛ شب سے ہی پھوٹتی ہے سحر

راہ اپنی نہ چھوڑیں گے ساغرؔ کبھی
چاہے دُشمن ہمارے ہوں یہ بحر و بر

غزل

لوگ دریا کو سینے لگاتے رہے
اور ہم پیاس کو آزماتے رہے

قتل گاہوں کو یہ کیسے وحشی مِلے
زخم کھا کر بھی جو مُسکراتے رہے

ہم وہیں ہیں جہاں تھے تری بزم میں
لوگ آتے رہے لوگ جاتے رہے

میرے پہلو میں تھا کوئی بیٹھا ہوا
اور تُم دیر تک یاد آتے رہے

لوٹ پایا نہ پھر سے پرندہ کوئی
لوگ سیٹی پہ سیٹی بجاتے رہے

نہ تخیل نہ جذبہ نہ معنی کہیں
ہم یہ کیسی غزل گُنگناتے رہے

میں کہ ساغرؔ کناروں کا تھا ہم نشیں
لوگ میرا جنوں آزماتے رہے

غزل

پارہ پارہ ہے پیرہن کِس کا
کِس نے لوٹا ہے بانکپن کِس کا

برف باری ہے چار سو پھر بھی
جل رہا ہے مگر بدن کِس کا

مہکی مہکی سی ہے شبِ فرقت
وا ہوا غنچہ٭ دہن کِس کا

بے خیالی کو میری کِس کا خیال
کھینچتا ہے مجھے سُخن کِس کا

زندگی دفن ہونے نِکلی ہے
میں نے پہنا ہے یہ کفن کِس کا

بھیڑ ہی بھیڑ راستہ ہی نہیں
پھر بھی تنہا ہے یہ بدن کِس کا

یوں تو فصلِ بہار ہے ساغرؔ
پھر بھی ویراں ہے یہ چمن کِس کا

غزل

سانس دھڑکن سوچ اُلجھن دیکھئے
آنکھ پتھر جِسم درپن دیکھئے

آرزو ہے علمِ کامل کی اگر
جائیے اور دِل کے آنگن دیکھئے

حق شِناسی میری، حق گوئی مری
بن گئی ہے میری دُشمن دیکھئے

یاد کرنا مُجھ کو میرے شہر میں
گر کہیں پر میرا بچپن دیکھئے

میرے گھر میں دیکھئے اپنا وجُود
اپنے گھر میں میرا درپن دیکھئے

باعثِ فن، فن بھی اور فنکار بھی
پے بہ پے ساغرؔ یہ مدفن دیکھئے

غزل

زمانے کو جو میری یاد پھر آئی تو کیا ہوگا
جو مُجھ سے چھین لی میری یہ تنہائی تو کیا ہوگا

میں چُپ ہوں زخمِ دِل پر تیری شہرت کا کئے مرہم
کہیں یہ داستاں اشکوں نے دُہرائی تو کیا ہوگا

نہ دیکھو اِس قدر بے باک نظروں سے تم آئینہ
تمہیں اپنی ہی صورت جو پسند آئی تو کیا ہوگا

گریباں چاک بے وحشت کہاں کرتا ہے دیوانہ
کِسی کے عشق میں ہوگا نہ دیوانہ تو کیا ہوگا

تمناؤں کے مرقد پر یہ کیسا شور ہے ساغر!
کہیں پھر سے کِسی حسرت میں جاں آئی تو کیا ہوگا

☆

قطعہ

تیرے وعدے کا اعتبار نہیں
اِس لئے تیرا اِنتظار نہیں
تیری فطرت ہے صرف سوداگری
عشق ہے عشق کاروبار نہیں

غزل

فریبِ زندگی کھایا ہوا ہوں
میں ناکردہ گُناہوں کی سزا ہوں

دِلوں کی پرورش ہوتی ہے غم سے
اِسی دولت کا میں اِک بادشاہ ہوں

ہنسو مُجھ پر میں اپنے دِل کے ہاتھوں
بھرے بازار میں رُسوا ہوا ہوں

کِسے فُرصت جو میری بات سن لے
میں اپنے آئینے سے بولتا ہوں

گہنہ ہے مُجھ کو اب انسان کہنا
اسیرِ نفسِ امارا ہوا ہوں

کیئے شمس و قمر تسخیر ساغر
مگر خود سے ابھی نا آشنا ہوں

غزل

سزائے عشق کو کیسے کہوں سزا کیسے
کہوں میں اپنی دُعا کو ہی بددُعا کیسے

اُسی کی یاد سے روشن ہیں زندگی کے چراغ
اُسے میں کیسے کہوں کیسے بے وفا کیسے

میں اُس کو چھوڑ کے آیا تو تھا مگر پھر بھی
وُہ میری سانس کی ہر تار میں بسا کیسے

اُڑان بھر کے خلا میں جو کھو گئے پنچھی
کہاں سے لائے اُنھیں ڈھونڈ کر فضا کیسے

وُہ موت جس پہ پشیماں ہے خُود بھی عزرائیل
میں ایسی موت کو کیسے کہوں قضا کیسے

جہاں پہ دار و رسن ہے مقامِ حق گوئی
نہ پوچھئے کہ یہ ساغرؔ وہاں جیا کیسے

غزل

آ تجھ میں سما جاؤں اے ساقیہ میخانہ
ساغرؔ مجھے کہتے ہیں کب ہوں کوئی بیگانہ

شاداب خیالوں میں آباد ہیں کچھ یادیں
ہیں اپنی محبت کے انداز جُدا گانہ

ہے شام ابھی لیکن ہر سمت اُداسی ہے
کیا جانے کہاں ہے اب وہ رونقِ میخانہ

رہزن ہے نہ رہبر ہے رستہ ہے نہ منزل ہے
عُشاق کی دُنیا میں کعبہ ہے نہ بُتخانہ

میں عشق و محبت کی تصنیف ہوں کُچھ ایسی
جس نے بھی پڑھا مُجھ کو وہ ہوگیا دیوانہ

یاں شیخ و براہمن کی سازش کا نہیں کھٹکا
بے خوف چلے آؤ یہ بزم ہے رندانہ

زخموں پہ نمک پاشی کرتے ہیں وہی ساغرؔ!
یوں جِن کے بظاہر ہیں انداز حکیمانہ

غزل

خیالوں میں ہمارے روبرو ہے
وہ جِس کا ذِکر ہر سو کوبکو ہے

تجسّس بڑھ گیا منزل بہ منزل
ہمیں اپنی ہی شاید جستجو ہے

ترے گلداں کے اِن پھولوں کی سُرخی
ہمارے ہی جِگر کا تو لہو ہے!

قضا اپنی ہے یہ ماحول اپنا
کہ جوں مقتول و قاتل دوبدو ہے

تمہیں سے لَو لگائے ہم ہیں بیٹھے
ہماری صُبح تُو ہے شام تُو ہے

جہاں انساں بکیں روٹی کی خاطر
وہاں محفوظ کِس کی آبرو ہے

یہ عالم جب بھی تھا اب بھی ہے ساغرؔ
قبا عاشق کی محتاجِ رفو ہے

غزل

دورِ گردوں ہم پہ ہر دم مہرباں ہوتا رہا
دِل کی دُنیا کا ہر اِک پل داستاں ہوتا رہا

سیم و زر کی کھنکھناہٹ لے گئی صبر و قرار
وائے سامانِ طرب آزارِ جاں ہوتا رہا

ہم نے تو پردہ کیا تھا دردِ دِل کا دوستو
کیا کریں ظالم نِگاہوں سے عیاں ہوتا رہا

ہم درِ جاناں پہ دستک پھول سے دیتے رہے
کیا کریں اُن کی طبیعت پر گِراں ہوتا رہا

ہم نے ہر اِک بزم کو ساغرؔ بنایا یادگار
ذکر اُس جانِ بہاراں کا جہاں ہوتا رہا

☆

قطعہ

رہنے کے لئے اپنے گھر میں مہماں سے اِجازت لینی ہے
جینے کے لئے اِنسانوں کو حیواں سے اِجازت لینی ہے
جس شہر میں ہم تُم رہتے ہیں اُس شہر کا ہے دستور یہ اب
اللہ کے گھر جانے کے لئے شیطاں سے اِجازت لینی ہے

غزل

پہن کر میں لِباس آوارگی کا
تماشہ کر رہا ہوں زندگی کا

غرورِ عشق میرا ٹوٹ جائے
جو مر کر بھی سہارا لوں کِسی کا

نظر کے تجرُبے نے کھو دیا ہے
بنایا تھا جو نقشہ زندگی کا

ہر اِک راہی سے پھرتا پوچھتا ہوں
پتہ کھوئی ہوئی اپنی ہنسی کا

بہ فیضِ گردشِ ایام میں نے
ہر اِک پہلو ہے دیکھا زندگی کا

ہر اِک شے ہے نشے میں چُور ساغرؔ
اثر شاید ہے میری بے خودی کا

غزل

مُجھ کو یونہی اُداس رہنے دے
حسرتیں آس پاس رہنے دے

عکس کی کُچھ تو آس رہنے دے
آئینہ بے لِباس رہنے دے

دشت کو آس پاس رہنے دے
دِل میں خوف و ہراس رہنے دے

ہجر کے تذکرے نہ چھیڑ ابھی
وصل کی کُچھ تو آس رہنے دے

خود کو بھی ہوش میں نہ آنے دے
مُجھ کو بھی بدحواس رہنے دے

درد دے پیار اگر نہیں دیتا
کُچھ نشاں میرے پاس رہنے دے

مئے اُلفت کے توڑ مت ساغرؔ
مُجھ کو آئی ہے راس رہنے دے

غزل

ہو گیا ہے مہرباں نامہرباں کیسے کہوں
دُشمنِ جاں ہو گیا وہ جانِ جاں کیسے کہوں

پوچھتا ہے میرے قاتل کا پتہ مُجھ سے طبیب
اپنے قاتل سے ہی اپنی داستاں کیسے کہوں

دِل کی دُنیا پر تری ہی بادشاہت ہے تو پھر
میں ترے ہی گھر کو تیرا میزباں کیسے کہوں

اِقتضائے سجدہ ہے مُجھ سے فریبِ زندگی
میں زمیں کے فرش کو اب آسماں کیسے کہوں

خرمنِ دِل کو جلا کر راکھ جس نے کر دیا
میرے دِل کا ہی تھا کوئی رازداں کیسے کہوں

پتھروں کے شہر میں احساس کا مارا ہوا
ہو گیا ہے کوئی ساغرؔ بے زُباں کیسے کہوں

غزل

اِظہارِ غم پہ وقت کے پہرے پڑے رہے
پلکوں پہ آ کے خون کے آنسو جڑے رہے

پھر اُن کے کنارے کوئی گھر کیسے بساتا
بستی اُجاڑ کر بھی جو دریا چڑھے رہے

کتنی حسین منزلیں دیتی رہیں صدا
ہم تھے کہ تیرے در پہ ہی صدیوں پڑے رہے

ہاتھوں سے گر کے ٹوٹ گئیں اُنگلیاں تمام
لیکن انگھوٹھیوں میں نگینے جڑے رہے

خوشیاں مری حیات سے آگے نکل گئیں
غم تھے کہ عمر بھر مرے پیچھے پڑے رہے

اُن کی جفا کا کِس لئے ساغرؔ گِلہ کریں
ہم بھی تو اپنی ضد پہ مسلسل اڑے رہے

غزل

رنج و غم احساس ساغر اِضطراب
جِسم سونچیں، رات بِستر نیند خواب

ہو چُکا میں ساری دُنیا پر عیاں
اور خُود سے کر رہا ہوں اجتناب

حُسن کی برسات ہی برسات تھی
عُمر بھر پیاسا رہا پھر بھی شباب

مُجھ کو صحرا نے سمندر کر دیا
اور پھر برسا تو برسا بے حِساب

عہدِ نو کے راستے پگڈنڈیاں
سر کش و آوارہ اور منزل سَراب

گُپ اندھیرا کیوں نہ ہو اِس شہر میں
ہر کِسی گھر کا ہے ڈُوبا آفتاب

میں وُہ ساغرؔ ہوں کہ اِک مُدت ہُوئی
میرے ہونٹوں کو ترستی ہے شراب

غزل

زندگی کا جب سے ہے اِظہار چُپ
ہو گئی ہے وادیِ گُلنار چُپ

کُچھ تو کہتی ہے ہواؤں کی نمی
یوں تو لگتے ہیں سبھی اشجار چُپ

رات بھر محشر بپا تھا شہر میں
صُبح دم سب بام و در دیوار چُپ

کاٹ دیں کُچھ، کُچھ زبانوں کو یہاں
کر گئے ہیں درہم و دینار چُپ

وقت کے ہاتھوں زُلیخا لُٹ گئی
کیوں نہ ہو یہ مصر کا بازار چُپ

میری خاموشی پہ گھر حیراں تھا
میں جو چیخا تو درو دیوار چُپ

کِس کا سر مقتل میں آتے یک بیک
چلتے چلتے ہو گئی تلوار چُپ

درد آخر کام اپنا کر گیا
روتے روتے ہوگیا بیمار چُپ

دِل میں ہلچل سی مچا دیتے ہیں کیوں
گرچہ ہیں ساغرؔ ترے اشعار چُپ

☆

قطعہ

فی زمانہ نسلِ آدم کا یہی خاصہ[1] رہا
حسرت وخواہش کا اِس کے ہاتھ میں کاسہ رہا
عُمر صحرائے بدن، سیراب کرنے میں کٹی
اور جو اِس کا مکیں تھا وُہ سدا پیاسہ رہا

[1] خاصیت کے معنوں میں

☆

دِل کی آنکھیں کھول اپنے کل کی تُو تصویر دیکھ
جو فضا کے دوش پر لکھی ہے وُہ تحریر دیکھ
غور کر انجام پر اپنے ستمگر غور کر
وقت کے پردے میں جو لپٹی ہے وُہ شمشیر دیکھ

☆

غزل

کُچھ اندھیرے کُچھ اُجالے زندگی
زندگی تیرے حوالے زندگی

موت ہر کوچے میں ہے رقصاں یہاں
تُو کہیں خُود کو چھُپا لے زندگی

مُجھ کو اِک مُدت ہُوئی روتے ہُوئے
تُو ہی تھوڑا مُسکرا لے زندگی

میں لکیروں میں لکھا ہوں تیرے نام
آ مجھے مُجھ سے چُرا لے زندگی

یہ سفر نظروں کا ہائے شوقِ دید
پڑ گئے آنکھوں میں چھالے زندگی

مُجھ کو صدیوں سے ہے میری ہی تلاش
کر مجھے میرے حوالے زندگی

بزم کا ساغرؔ تو صحرائی ہُوا
تُو نئی دُنیا بسا لے زندگی

غزل

ہائے وُہ وقت کیا تمام ہُوا
جب اُجالا اسیرِ شام ہُوا

زندگی کی طویل راہوں کا
شہرِ دِل میں سفر تمام ہُوا

میرے اندر چھُپا ہُوا ہے کوئی
آج مُجھ سے جو ہمکلام ہُوا

بادشاہوں کا بادشاہ ہے جو
پنجتن پاک کا غلام ہُوا

باغِ جنت ہے کِتنا پاکیزہ
ایک لغزش سے جو حرام ہُوا

یہ مرے شہر کی کہانی ہے
جو بھی گونگا تھا وُہ اِمام ہُوا

کِس میں ہمت ہے پھر اُسے روکے
وقت ساغرؔ جو بے لگام ہُوا

غزل

جھر جھر جھرنے بہتے ہیں
کیا جانے کیا کہتے ہیں

وُہ ہم سے ہیں دُور بہُت
پہلو میں جو رہتے ہیں

ظالم کے مُجرم، مظلوم
چُپ رہ کر سب سہتے ہیں

پل پل ارمانوں کے محل
شہرِ دِل کے ڈھتے ہیں

بھنورے، پھول، پکھیرو اب
سہمے سہمے رہتے ہیں

ساغرؔ صاحب صبر کرو
آپ ہمارے چہتے ہیں

غزل

کاش اِک بار وقت سو جائے
خواب میرا نصیب ہو جائے

پیار کی ایک ایسی بارش ہو
داغ نفرت کے سارے دھو جائے

آگ آنسو ہیں بر سرِ پیکار
دیکھئے جیت کِس کی ہو جائے

پھر سے اِنساں اُگیں، کوئی دہقاں
آئے اور بیج ایسے بو جائے

ہے تعصب کی دھوپ تیز بہت
پیار پنچھی کہیں نہ سو جائے

یہ مری حسرتوں کی تربت ہے
جس کو فرصت ہو آ کے رو جائے

زندگی کی اُداس راہوں میں
تیرا ساغرؔ کہیں نہ کھو جائے

غزل

صبر کو آزماؤں گا شاید
میں تُجھے بھول جاؤں گا شاید

میرے اِتنے قریب مت آؤ
میں تیرا دِل دُکھاؤں گا شاید

آج جی بھر کے مُجھ کو رونے دو
کل سے میں مُسکراؤں گا شاید

اپنے احساس کو غزل کر دو
میں تُمہیں گُنگُناؤں گا شاید

رنگ آیا ہے پھر سے گیتوں پر
پھر سے محفل سجاؤں گا شاید

ایک دِن اور شہر میں رُکنا
میں ترے ساتھ آؤں گا شاید

مُجھ سے ساغر لپٹ کے روتا ہے
میں اِسے چھوڑ جاؤں گا شاید

غزل

ہائے کیا موسم ہمارے ہو گئے
راستے مسدود سارے ہو گئے

پانی پانی کر رہے تھے تشنہ لب
حادثے دریا کنارے ہو گئے

پھر اچانک ڈل کا پانی جل گیا
اور پھر ویراں شکارے ہو گئے

شب کی تاریکی میں تھے جو راہبر
ہائے وُہ جگنو ستارے ہو گئے

بخش دی ہے پیاس اپنی آپ کو
آپ کے دریا ہمارے ہو گئے

دِل کی بستی سے ہُوا کِس کا گُذر
زخم تازہ پھر ہمارے ہو گئے

کاغذی کشتی تھی ساغرؔ کی حیات
بے وفا پانی کے دھارے ہو گئے

غزل

جتنی چاہیے اُٹھاؤ دیواریں
آؤ مُجھ پر گِراؤ دیواریں

مُجھ کو طوفان بن کے آنا ہے
جاؤ گھر کی بچاؤ دیواریں

وقت اُترا ہے پھر بغاوت پر
جاؤ کُچھ اور لاؤ دیواریں

سرحدیں خُود بہ خُود فناہ ہونگی
پہلے دِل کی گِراؤ دیواریں

تُم کو درکار ہے اگر منزل
خاک میں تُم مِلاؤ دیواریں

بچے بچپن میں ہی نہ بٹ جائیں
تُم اِنہیں مت دِکھاؤ دیواریں

مُجھ کو ساغرؔ سے جا کہ مِلنا ہے
درمیاں سے ہٹاؤ دیواریں

غزل

کوئی پل بھی تُجھے بھولا نہیں ہوں
اکیلا ہوں مگر تنہا نہیں ہوں

مرا آئینہ مُجھ سے کہہ رہا ہے
ترا ہی عکس ہوں تُجھ سا نہیں ہوں

میں ہوں بازارِ اُلفت کا مسافر
میں لُٹتا ہوں مگر بِکتا نہیں ہوں

مِری لغزش مری پستی کا باعث
تجھی سے ہوں جواب تُجھ سا نہیں ہوں

میں ایسا پیڑ ہوں کہہ دو ہوا سے
جھُکا تو ہوں مگر جھُکتا نہیں ہوں

مری چُپ میں چھُپی ہیں داستانیں
میں ساغر ہوں مگر چھلکا نہیں ہوں

غزل

بے نام سفر تنہا تنہا
یادوں کی ڈگر تنہا تنہا

تصویر تری تری صورت
اور میری نظر تنہا تنہا

بستی بستی ہُوٗ کا عالم
گھر گھر ہیں مگر تنہا تنہا

باہر مُشکل اندر مُشکل
اور اُس پہ سفر تنہا تنہا

پنچھی جو قید سے چھوٹے تو
لوٹے سب گھر تنہا تنہا

صحرا صحرا محفل محفل
تنہا ساغرؔ تنہا تنہا

غزل

خوشی میں جھومتا پنچھی اگر ہے
نئے موسم کی بارش کا اثر ہے

مُسافر راہِ اُلفت کے مُسافر
سنبھل کر چل یہ رستہ پُرخطر ہے

اُدھر بے چین ہیں پنچھی اِدھر بھی
مگر صیاد بھی دیوار پر ہے

کِسی کی سوچ کیوں ہو سوچ میری
مرا سر تو ابھی میرا ہی سر ہے

مری پہچان ہے اُس آئینے کو
مرے کمرے میں جو دیوار پر ہے

اِسے جُرمِ محبت کی سزا دو
یہ ساغرؔ واسئے اُلفت نگر ہے

غزل

شام سُہانی جام کے صدقے
مرگ نینن کے نام کے صدقے

میں ہوں تیرا پاگل پریمی
صدقے اِس اِلزام کے صدقے

آنکھوں کی برسات کا موسم
ساوَن رُت کی شام کے صدقے

میراںؔ پی گئی وِش کا پیالہ
اپنے گِردھر شام کے صدقے

اَمن و سکوں کا ہے جو ضامن
ہم سب اُس اِسلام کے صدقے

پنچھی جو اُڑ کر لائے ہیں
ساغرؔ اُس پیغام کے صدقے

غزل

گونگی بستی بہرے لوگ
ہم تُم سب بے چہرے لوگ

بے چہرے اِنسانوں کو
پہناتے ہیں سہرے لوگ

لوٗٹ گئے گھر آنگن آخر
بیٹھے تھے جو پہرے لوگ

وقت نے بے بس کر ڈالے ہیں
گہری سوچ کے گہرے لوگ

خون سے گھر تعمیر کئے ہم
آخر ہم ہی ٹھہرے لوگ

غم کے بھنور میں نام ؔبھی کا
لے کر ساغرؔ پیرے لوگ

غزل

یہ زنداں اور یہ زنجیر ہو گی
خبر کیا تھی مری تقدیر ہو گی

مرے بدلے مرے بچوں کے آگے
مرے گھر میں مری تصویر ہو گی

مری بیوی اُلجھ کر اُلجھنوں سے
مثالِ وادیٔ کشمیر ہو گی

اگر ٹوٹی ہو نیندیں بے حسی کی
مری بستی بھی اب دِلگیر ہو گی

ہماری حسرتوں کے قاتلوں کی
جبیں پر خوف کی تحریر ہو گی

یقیں کرلوں کہ ساغرؔ کے لبوں پر
صداقت ہی صدا تحریر ہو گی

غزل

لُطف لیتے ہیں وہ ستانے میں
اور ہم دِل پہ چوٹ کھانے میں

عُمر گُذری ہمیں خبر نہ ہُوئی
آرزوؤں کا گھر سجانے میں

کِس کو پوجیں کِسے کریں سجدے
ہیں خُدا ہی خُدا زمانے میں

ایک خط کا ہے اِنتظار مُجھے
دیر کِتنی ہے اُس کے آنے میں

مُسکرانے کی بات کرتے ہو
وُہ بھی اِس غمزدہ زمانے میں

رازِ کونین کھُل گیا ہم پر
تیرے آنے میں تیرے جانے میں
تُجھ کو ساغرؔ کبھی نہیں بھُولا
دشت میں ہو کہ آشیانے میں

غزل

سب کو کرتے ہیں جاں بلب اخبار
گھر میں آتے ہیں میرے جب اخبار

زندگی ہو گئی ہے بے ترتیب
چیختے آج کل ہیں سب اخبار

اِن میں ترغیب نفرتوں کی ہے
بند کر دو یہ سب کے سب اخبار

اپنی اپنی الاپتے ہیں سبھی
ہر کوئی گھر لگے ہے اب اخبار

اب تو ناخواندہ لوگ بھی اکثر
لے کے پھرتے ہیں بے سبب اخبار

اُمن کی اِک خبر کا متلاشی
کوئی ساغر پڑھے ہے کب اخبار

غزل

ہونٹ خاموش تھے نظر خاموش
ایک آواز تھی مگر خاموش

اِک ستارہ کہیں جو ڈوبا تو
ساز خاموش نغمہ گر خاموش

چیخ ایسی کہ روح کانپ اُٹھی
یوں بظاہر تھی رہگذر خاموش

ایک طوفاں تھا اِک تلاتم تھا
آج دریا ہے، کس قدر خاموش

شہرِ خاموش جیسا سناٹا
میری بستی کے بام و در خاموش

منزلوں پر بھی روزِ محشر تھا
ہو گیا جب مرا سفر خاموش

کارواں لُٹ کے رہ گیا ساغرؔ
کیوں رہا پھر بھی راہبر خاموش

غزل

کیوں کِسی سے کوئی گِلہ رکھنا
دِل میں جو کُچھ ہو برملا رکھنا

خواب میں ہی سہی مگر ہم سے
آنے جانے کا سلسلہ رکھنا

سانپ ہیں سانپ ڈنس بھی لیتے ہیں
رشتے ناتوں سے فاصلہ رکھنا

ہاتھ ملتے ہیں چھوٹ جاتے ہیں
دِل سے تُم دِل کا رابطہ رکھنا

مُجھ سے مِلنے کو آرہے ہیں جناب
مُجھ سے مِلنے کا حوصلہ رکھنا

ہے اندھیرا کہیں نہ کھو جانا
دِل کا ساغر دیا جلا رکھنا

غزل

حصارِ ذات سے باہر ہُوا تو
اگر یہ مرحلہ بھی سر ہُوا تو؟

سفر کا کیا مرے انجام ہو گا
اگر ظاہر کبھی خود پر ہُوا تو

جِسے مندر سمجھ کر ڈھ رہے ہو
وُہ اندر سے خُدا کا گھر ہُوا تو

تُجھے معلوم ہوگی تیری عظمت
نظر سے تُو اگر منظر ہُوا تو

جلا ڈالو ہمارے گھر کو لیکن
تُمہارا گھر ہمارا گھر ہُوا تو

مِٹے گی تشنگی صدیوں پُرانی
ترا ساقی اگر ساغر ہُوا تو

غزل

بھٹکتا ہوں جہانِ نے ہاؤ ہُو میں
نہ جانے کب سے تیری جستجو میں

وہاں اِنصاف کی اُمید معنیٰ
جہاں اُلجھا ہو مُنصِف رنگ و بُو میں

میں باشندہ ہُوں ایسی سرزمیں کا
جہاں ہر آنکھ ڈوبی ہے لہو میں

کبھی مجنوں کبھی سرمد کی صورت
میں سرگرداں ہُوں اپنی جستجو میں

لُٹا ہے شہرِ دِل ساغرؔ کا شاید
نظر آیا یہ اُسی کی گفتگو میں

☆

قطعہ

مدتوں سے اُداس تھے جنگل، دم گھٹا جا رہا تھا دھرتی کا
سر بہ خم تھے شرم سے سب دریا، آب در آب تھے سبھی چشمے
ایک طوفاں برف کا جو آیا، سب کو سیراب کر کے ڈُوب گیا

فروری 2004

غزل

عقل کو ہم نے جب شعور کیا
من و تُو کا جہاں عبور کیا

پیکرِ 'میں' کو چور چور کیا
دفن تُو نے اگر غرور کیا

آپ جو کُچھ کریں حضور کریں
ہم سے جو ہو سکا حضور کیا

جس نے پائی نظر بصیرت کی
سارے عالم کو کوہِ طور کیا

اُس کو کیا غمِ حساب و نجات
جس نے دِل سے دوئی کو دُور کیا

دورِ حاضر میں جھوٹ سے پرہیز
ہے گنہ، ہم نے جو حضور کیا

شُکریہ تیرا اے غمِ دوراں
تُو نے ساغرؔ کو باشعور کیا

غزل

چاند چہرے پہ زُلف برہم ہے
ہائے کِتنا حسین موسم ہے

گُنگُناتی ہُوئی ہواؤں میں
تیری آواز کی ہی سرگم ہے

بال آیا ہے شیشہ ٔ دِل میں
اِس لئے تیری آنکھ بے دم ہے

شب کے سینے میں تیری یادوں کے
دیپ جلتے ہیں روشنی کم ہے

کوکھ دھرتی کی جل کے راکھ نہ ہو
جب ہی موسم کی آنکھ پُرنم ہے

قلبِ اِنساں کی روشنی سے بہت
ساری دُنیا کی روشنی کم ہے

غزل

ہوا سے جِس دِن خطاب کرنا
چراغ کو آفتاب کرنا

سفر کو یوں کامیاب کرنا
سراب سے اجتناب کرنا

خزاں کے پھولوں کو تم سجا کر
ہوا کو مت بے نقاب کرنا

الٰہی مُجھ پر کرم کا سایا
کرو تو پھر بے حساب کرنا

سند ملی ہے یہ جاہلوں کو
پڑھے لکھوں کو خطاب کرنا

مرا تعلق ہے میکدے سے
مرے حوالے شراب کرنا

دیارِ خوشبو میں تم بھی ساغرؔ
گُلاب کا انتخاب کرنا

غزل

میں روتا ہوں وہ ہنستا ہے
کون مرے اندر بستا ہے

یاد کا اِک بے نام جھروکا
شام وسحر دِل کو ڈستا ہے

دردر جِس کو ڈھونڈ رِہے ہو
دِل کے آنگن میں بستا ہے

یہ بستی! یہ کیسی بستی؟
خون جہاں اِتنا سستا ہے

رستہ رستہ اِک منزل ہے
منزل منزل اِک رستہ ہے

روزِ ازل جو تیر چُبھا تھا
آج بھی دِل میں پیوستہ ہے

صحرا کو وحشی سے محبت
دریا پیاس سے وابستہ ہے

تیری بات بھی موزوں ساغر
میرا لفظ بھی برجستہ ہے

غزل

زندگانی سے آشنا نہ ہو
عشق میں جو کہ مُبتلا نہ ہوا

دِل ہے آباد تیری یادوں سے
کیا ہوا وصل گر ترا نہ ہوا

وہ اُدھر ہم اِدھر ہوئے پھر بھی
ختم یادوں کا سلسلہ نہ ہوا

رائیگاں ہو اگر فغانِ شب
پھر خُدا کیا خُدا، خُدا نہ ہوا

دِل کِسی اور کو میں کیسے دوں
تُجھ سا کوئی تو دوسرا نہ ہوا

تیرا احسان ہے ترا احسان
درد ہم کو مِلا بُرا نہ ہوا

ہو گیا ہو گیا جو ہونا تھا
اور جو نہ ہوا ہوا نہ ہوا

موت اور زندگی میں اے ساغر
اِک نفس کا بھی فاصلہ نہ ہوا

غزل

یہ درد اب کِس قدر کم ہو گیا ہے
ہمارا زخم مرہم ہو گیا ہے

مسافر کا سفر کم ہو گیا ہے
مگر وہ کِتنا بے دم ہو گیا ہے

مرا قد بڑھ گیا حد سے زیادہ
مگر سایہ بہت کم ہو گیا ہے

گھٹن سی ہے فضائے بحر و بر میں
یہ کیسا اب کے موسم ہو گیا ہے

کبھی جذبات پتھر ہو گئے ہیں
کبھی احساس پُرنم ہو گیا ہے

یہ کیسا قافلہ ساحل پہ آیا
سمندر پھر سے شبنم ہو گیا ہے

جنوں تیرا ترا احساس ساغرؔ
ترے شعروں میں مدغم ہو گیا ہے

غزل

نہ بے وفا ہے کوئی اور نہ باوفا کوئی
یہ دِل کی بات ہے اچھا کوئی بُرا کوئی

کوئی چراغ جلا کر ہوا سے لڑتا رہا
ہوا کو دیکھ کر ہوتا رہا ہوا کوئی

میں مر رہا ہوں بہ ہر حال مر رہا ہوں میں
نہ زندگی کی مجھے دیجئے دُعا کوئی

تمام شہر ترستا تھا اُس کی قربت کو
ہتھیلیوں میں چھپائے تھا معجزہ کوئی

کہیں دُعا کے تعاقب میں میرا دستِ دُعا
کہیں تلاشتی رہتی ہے بددُعا کوئی

کِسی حسین نے ہم کو بھی ٹوٹ کر چاہا
بہت عزیز ہمیں بھی مگر رہا کوئی

سبھی پُکار رہے تھے کہ کوئی ساغرؔ تھا
ہمارے شہر میں آیا تھا دِل جلا کوئی

غزل

اہلِ دِل پیکرِ وفا ہوگا
جو کوئی درد آشنا ہوگا

بھول آیا اُسے نہ جانے کہاں
دِل مرا مُجھ کو ڈھونڈتا ہوگا

پا بہ زنجیر ہے مرا احساس
بدنصیبی پہ رو رہا ہوگا

تیری خاطر جو لُٹ چُکا اے دوست
میں نہیں کوئی دوسرا ہوگا

مری توبہ جو ہے زمانے کا
جو مرا بھی وہی خُدا ہوگا

ہوں چراغِ سحر بدوشِ ہوا
پوچھتے کیا ہو کیا مرا ہوگا

بے سبب اُس نے دِل نہیں توڑا
پھول کوئی نیا کِھلا ہوگا

پوچھتے کیا ہو کیا ہوا ساغرؔ
شہرِ اُلفت میں لُٹ چُکا ہوگا

غزل

آسماں خود پہ ناز کرتا تھا
تیرے شانے پہ جب بکھرتا تھا

سائے بن بن کے چھیڑتی تھی ہوا
میں بھی بچپن میں کِتنا ڈرتا تھا

تیری خوشبو کا دلنشیں جھونکا
میرے آنگن سے کب گُذرتا تھا

میں تُجھے دیکھتا تھا دورِ تلک
راستہ ڈوبتا اُبھرتا تھا

وہ کہ چُپ چاپ سوچتا تھا مجھے
میں کہ چُپ چاپ اُس پہ مرتا تھا

میری ہمت کہاں سے لوٹ آئی
لب کُشائی سے میں تو ڈرتا تھا

اُس کو بھی اعتماد تھا ساغرؔ
میں بھی خود پر یقین کرتا تھا

غزل

آنکھ دریا ہے دِل سمندر ہے
کشتیٔ عشق اِس کے اندر ہے

سوچ بنجر ہے ہاتھ خنجر ہے
حاکمِ وقت بھی ستمگر ہے

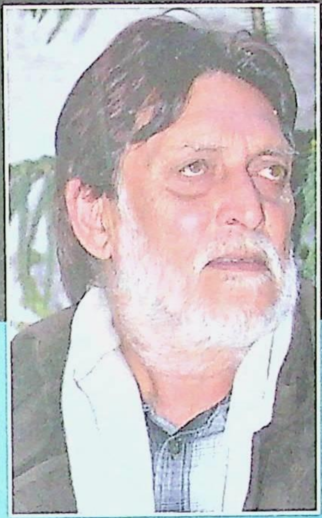
ہے بہانہ کہیں جسے تدبیر
اور جو ہو وہی مقدر ہے

دِل کی دُنیا میں ڈوب کر دیکھو
رازِ ہستی اِسی کے اندر ہے

اب تو جھڑتے ہیں سبز ہی پتے
اِک نیا موت کا یہ منظر ہے

تاج میں آج سنگ ہیں ساغرؔ
اور کیچڑ میں ہے جو گوہر ہے

میں اپنی پیاس پہ نازاں ہوں ساغر



Lab Tashna Aaankh Samandar, Urdu Poetry

By:

SAGHAR SEHRAI

Year of Publication-2018

میں اپنی پیاس پر نازاں ہوں ساغر
لہو پینا مجھے آتا نہیں ہے



BOOKS
THE CONTEXT

Price Rs.350.00

ISBN 978-2-12-345680-

9 782123 456803

SIYAQPUBLICATIONS

59/A, Tawi Vihar, Sidhra, Jammu-180019 (J&K)

www.urdualive.com, siiaqpublications@gmail.com, 09086261113